

سر سید کا سفر نامہ: ”مسافر ان لندن“

مع تازہ اضافوں، مقدمہ، فرہنگ اور تعلیقات

مرتبہ: اصغر عباس

زاید تنگ نظر اور کافر بدگماں کے مشترک شکار اقبال اور سر سید دونوں رہے۔ اقبال تو اس آزمائش سے دورانِ حیات ہی مُکلت ہو گئے۔ سر سید کو دورنگی کی تہمت سے بعد از وفات بھی امان نہیں ملی۔ زندگی بھر انگریزوں کی دریوزہ گری اور نوجوانوں کی کرستان سازی اور تنزیلِ رحمانی کی تفسیر میں ہیرا پھیری کا الزام سہتے رہے۔ آزادی کی لہروں کے تیز ہوتے ہی ان کی حب وطن پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔ پنڈت نہرو کی عادلانہ سند ملک دوستی کے باوجود کوتاہ ہیں ان کو دوقومی نظریہ کا موجد اور پاکستانی جنم داتاؤں کا امام فرض کرتے رہے، اپنے لیے ایک وقیع سیاسی نسب نامہ کی تلاش میں کچھ پاکستانی دانشوروں نے بھی ان سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ فرخندہ نیت سید ہند نواز پر ایک اور داغ لگا۔ مخاصمت کی چنگاری کو پر لگ گئے۔ وہ اور علی گڑھ ہدفِ ملامت ٹھہرے۔ برسوں بعد سیروائی کی حقیقت افزا تاریخ آزادی شائع ہوئی۔ غلط فہمیوں اور تقسیم ہند کی تنہا مسلمانوں کی ذمہ داری کے کچھ جالے صاف ہوئے، اور اس المیہ کے کچھ دوسرے کردار بھی سامنے آئے۔ مولانا آزاد کی *India Wins Freedom* کے تیس محفوظ اور غیر مطبوعہ صفحات سامنے آئے۔ انھوں نے بھی بدگمانیوں کے دُھند کو کچھ کم کیا۔ مسلمان مبصروں اور مورخوں کو بھی ہمیز لگی، اور سید مستقبل شناس پر قلم و قراطس کے ہلکے پھلکے دسترخوان پھنسنے لگے۔ علی گڑھ میں خلیق احمد نظامی نے ان پر ایک مختصر کتاب لکھی۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے آغوش استقبال واکی، اور سر سید کا شمار نئے ہندوستان کے معماروں میں ہونے لگا۔ شان محمد نے معتد بہ اور اصغر عباس نے اپنا تمام تر سرمایہ تحقیق اس میں لگا دیا۔ مؤرخ الذکر تو اپنی زنجیل سے نت نئے پہلو اور مضامین نکالتے رہتے ہیں۔ ادھر افتخار عالم خاں نے چند سال سے سر سید کی حیات اور تعمیرات پر دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں، اور

اب اپنی تحقیق کے مُحبِ شناسے کی مدد سے اس معماری ملت و مُلک کے درون خانہ کا معائنہ اور مذاکرہ جاری ہے۔

سرسید اکیڈمی کی سربراہی کے دوران اصغر عباس نے تصانیف سید کی اشاعت نو اور ترجمے کی روایت جاری کی ہے۔ نظامی کی انگریزی کتاب کو خود اردو کا قالب دیا، اور سنسکرت، عربی، ملیالم، تامل اور تیلگو زبان میں سرسید کی سوانح شائع کی۔ ”آثار الصنادید“، ”خطبات احمدیہ“، ”تاریخ فیروز شاہی“، ”آئین اکبری“، ”بائبل“ کی تفسیر اور ”تزک جہانگیری“ کے تازہ ایڈیشن شائع کیے۔ حالی کی ”حیات جاوید“ منتخب مضامین و خطوط اور خطبات سرسید کے انگریزی تراجم کا نظم کیا۔ تاکہ اس بلند قامت مصلح کے کوائف و حالات کو غیر اردو خواں وسیع تر دنیا سے روشناس کرایا جاسکے۔ کئی عالمانہ سرسید یادگاری لکچروں کا انعقاد کیا۔ سدھارتھ شکر رے کا خطبہ خاص طور سے لائق ذکر ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس سلسلہ کی تازہ ترین کڑی ہے۔ ”شروع کی بات“، یعنی دیباچہ، سلیقہ سے دلکش پیرایے اور زبان میں سفر کے موقع، مشن اور مشمولات کا خلاصہ و جائزہ پیش کرتا ہے۔ مگر اس تدوین کا اصل جوہر آخر میں دیے گئے فرہنگ و تعلیقات ہیں، جن کے بغیر آج کے بیشتر قاری نیم مجہول حوالوں اور افراد کی اہمیت سے شاید بے خبر رہتے۔ یہ سفر بنارس سے یکم اپریل ۱۸۶۹ کو شروع ہوا۔ بحری سفر کا بمبئی سے ۱۰ اپریل کو آغاز ہوا۔ وسط ۱۸۷۰ میں ہندوستان واپسی ہوئی۔ اس سفر کے کوائف، تجربات اور مشاہدات وہ پابندی سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کو ارسال کرتے رہے۔ ان ۳۸ مراسلوں اور کچھ اضافی متعلقہ مواد پر سفر نامہ کا متن مشتمل ہے۔ اردو میں چند سفر نامے اس سے پہلے بھی ملتے ہیں۔ ابوطالب اصفہانی لندن ۱۷۹۹ء میں ایک سیاسی مشن پر لندن گئے۔ ان کا سفر نامہ بعد میں اردو میں منتقل ہوا۔ ۱۸۳۶ء میں یوسف خاں کمبل پوش نے سیاحت انگلستان کی، اور ”تاریخ یوسفی“ کے عنوان سے اس کی اشاعت ۱۸۴۷ء میں ہوئی۔ ۱۸۵۶ء میں مسیح الدین علوی کا کوردی اودھ کے وکیل کی حیثیت سے وہاں گئے تھے اور ان کا سفر نامہ ”سفیر اودھ“ کے نام سے شائع ہوا۔ مگر یہ سب سطح ہیں اونچی سوسائٹی کے مشاہدات کا تقریباً ”یک مشت“ بیان ہیں۔ تنوع اور فکری گہرائی سے خالی۔ البتہ شاید ابوطالب اصفہانی کی غزلوں کے انگریزی اور فرانسیسی تراجم اخبارات میں چھپے، اور مقبول ہوئے۔ انھوں نے اس صنفِ نظم کو انگریزی شاعری میں کچھ عرصہ معروف اور مروج رکھا۔ اس کے برعکس ”مسافران لندن“ دو مختلف تہذیبوں اور اقوام کے درمیان دیرپا افہام و تفہیم کا پیش خیمہ اور ہندوستانی سماج بالخصوص مسلمانوں کی تعلیمی بیداری اور نظام پر دور رس اور

مستقل چھاپ کا ذریعہ ثابت ہوا۔

اجازت سفر اور ملازمت سے رخصت کی درخواست میں سید محترم نے اس سفر کے ذریعہ تہذیبی اور تعلیمی روابط کے فروغ کا بین حوالہ دیا تھا، جو حاکم و محکوم کی باہمی مفاہمت کے ضامن ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن میں دواہم ذیلی مقاصد بھی تھے، جن کا دفتری درخواست میں تذکرہ مناسب نہیں تھا۔ البتہ ان کے بعض مکتوبات میں (بالخصوص محسن الملک کے نام) ان کی صراحت ہے۔ چنانچہ ایک اہم مقصد سرولیم میور نے تاریخ اسلام اور شارح اسلام صلعم کے عقائد اور حیات پر جو غلط بیانیوں اور متعصبانہ استدلال کیا ہے اس کی تردید و اصلاح بھی تھا۔ اس کا مواد انگلستان کے کتب خانوں میں موجود تھا۔ ہندوستانیوں کے لیے مناسب عصری تعلیمی نظام، نصاب و معیار کی جستجو بھی ان مراسلوں سے عیاں ہے۔ اسی باعث ان کا سفر لندن اپنے پیش روؤں سے زیادہ وسیع اور خوش انجام ہے۔ اپنے دونوں صاحبزادگان سید حامد اور سید محمود کی وہاں اعلیٰ تعلیم کے واسطے ہندو بست بھی درکار تھا۔ اس کا بھی مناسب نظم ہو سکا۔ سرسید کی انگریزوں سے مرعوبیت اکثر معرض بحث بنتی ہے، اور ہندوستانیوں کے واسطے تلخ اور بظاہر اہانت آمیز الفاظ گرفت میں آتے ہیں۔ ان میں دراصل کسی دل جلے خیر خواہ کی اپنائیت آمیز جھلاہٹ مضمر ہے، بدخواہ کی حقارت نہیں۔ لندن میں اشرف سے اور صاحبان اختیار سے سید صاحب کی ملاقاتیں آزادانہ اور مساویانہ ہوتی تھیں۔ معمولی اور ادنیٰ کارکنوں کا ذکر بھی وہ شائستگی سے اور ان کی خوبیوں کے جائز اعتراف کے ساتھ کرتے ہیں، جو صاحب بیان کی خود اعتمادی، آزادی رائے اور انسان دوستی کی دلیل ہے۔

سرسید کی غیر معمولی قوت مشاہدہ اور جزئیات بینی سفر نامہ کے ہر صفحہ پر عیاں ہے۔ جہاز کا بیان بڑی تفصیل سے دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے مسافروں کے علاوہ، عملے کی تعداد، ان کے عہدے مع ناموں کے درج ہیں (ص، ۱۴۹)۔ نئے مسافروں کے لیے نہایت مفصل مشورے بلکہ سفر کی ترغیب و تشویق شامل ہیں۔ ہندو عازمان کو مشورہ ہے کہ اپنے ساتھ پچیس دن کا پکا ہوا خشک کھانا لے جائیں۔ اور ایسا کھانا لے

جائیں کہ گوشت خوری کے مہاپاپ سے محفوظ رہیں۔ ان کی تعلیم اور بہتری بھی منظور ہے، چنانچہ اس دعا سے ان سے کیسی محبت اور یگانگت نکلتی ہے: ”خدا ہمارے وطن بھائی ہندوؤں کو بھی توفیق دے کہ وہ اپنے ملک سے باہر قدم نکالیں اور دنیا کا تماشا اور خدا کی قدرت کا کارخانہ دیکھیں، اور شائستگی و سویلیزیشن سے روشن ضمیر ہوں“ (ص، ۱۳۶)۔ بعض تنگ نظر حلقوں میں ان پر فرقہ پرستی اور علاحدگی پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے جو

واقعات سے میل نہیں کھاتا۔ وہ اپنے ہندو احباب سے کھلے دل سے ملتے تھے اور ان کے خلوص کا بھی فراخ دلانہ اعتراف کرتے تھے۔ مثلاً کلفٹن میں اپنے ایک پرانے انگریز دوست مسٹر بٹن سے ملاقات کے ذکر میں بتاتے ہیں کہ مسٹر بٹن نے راجہ جے کشن داس کا حال پوچھا جو سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری تھے۔ ”میں نے سب حال کہا، اور یہ بھی کہا کہ راجہ صاحب کو سکریٹری کہنا ان کی حق تلفی ہے۔ بلکہ ان کو سیویر (Saviour) آف سوسائٹی کہنا چاہیے“ (ص، ۱۳۸)۔ ایک منصف مزاج اور تعصب سے پاک انسان ہی یہ لکھ سکتا ہے۔ اس مومن دانا کو دانش گاہوں میں بہ وجوہ خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ کیمبرج یونیورسٹی کا احوال نہایت شرح و بسط سے لکھا ہے۔ اس کی تاسیس، تاریخ اور انتظامی خاکہ بالصراحت بیان کیا ہے۔ عہدیداروں کے حقوق و فرائض، الحاق شدہ کالجوں کی بہت سے امور میں خود مختاری، ان میں سے بعض کی تاریخ، اوقاف کا نظم، نصاب کی تفصیل، وہاں کے ممتاز فراغت یافتگان کا ذکر، کتب خانے، نادر مخطوطات، نایاب مطبوعات، مشہور شاعر جان ملٹن کے شاہکاروں کے اولین مسودات، ان سب کی تفصیل دینے کے بعد جو دعاماں گئی، اس کے ہر فقرے سے حب وطن اور علم دوستی مترشح ہے: ”کیمبرج کی یونیورسٹی کی سیر سے جو اس قدر دانش مندی اور فیاضی اور جاں فشانی اور محنت کے ثبوت میری نظر سے گزرے، ان کے دیکھنے سے مجھ کو نہایت حیرت ہوئی۔ اور میں نے اپنے دل میں بہ آرزوئے ناتمام یہ دعاماں گئی کہ میرے وطن ہندوستان میں جو ہندوستانیوں کی طبیعت میں ہنوز ہمسری اور ترقی کا جوش نہیں ہے، وہ بہت جلد براہیجنت ہو، کہ اس کو بھی آئندہ کسی زمانہ میں، جو نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ہنوز بہت دور ہے، علوم و فنون میں مشرقی ملکوں میں ایسی ہی شہرت اور عظمت حاصل ہو، جیسی کہ انگلستان کو مغربی ملکوں میں حاصل ہے“ (ص، ۱۷۲)۔ ۱۸۵۷ء کی تاریخی سال کے سترہ سال کے اندر ہی یہ رجائیت اور فرخندہ فکری اس مردِ عظیم کی اولوالعزمی اور آرزوئے مستقبل سازی کا بین ثبوت ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا نقشہ اور عزم ان کے عہد ساز ذہن میں جنم لے چکا تھا۔

ایک دوسرے مراسلے مطبوعہ ۶ جنوری ۱۸۷۱ء (ص، ۲۲۲ تا ۲۱۷) سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے فاضلان لندن سے مشورہ کے بعد ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے ۳۶ (بیشتر) سائنسی علوم، مثلاً طبیعیات، ریاضی، فنِ تعمیرات، فلکیات، بجلی، علوم حیوانیات و نباتات، باغبانی، جیولوجی، اپلائیڈ سائنس، منطق، جغرافیہ، تاریخ، علم الادویہ اور اخلاقیات و انتظام حکومت تجویز کیے ہیں۔ ایک دوسرے مکتوب مطبوعہ ۲۶ مارچ ۱۸۶۹ء میں ہندوستانیوں کے واسطے وظائف برائے اعلیٰ تعلیم (انگلستان میں) کی تفصیل، ضروری شرائط، درخواست

گزاری کا طریقہ اور ملک کے مختلف علاقوں کے واسطے ان کی مختص تعداد و رقم مذکور ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں ان کا مرتب ذہن کتنے متنوع عصری مسائل اور وسائل کی آگہی رکھتا تھا، وہ یقیناً لائق رشک اور فقید المثال ہے (ص، ۲۲۳ تا ۲۲۶)۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے سلسلہ میں انھوں نے ایک مکالمے کی شکل میں اہل ہند کے واسطے ایک دلچسپ نظریہ پیش کیا ہے (ص، ۲۰۹ تا ۲۱۶) ہے۔ وہاں کے اسکولوں کی قسمیں، گرامر (یعنی بنافیس اسکول؟) ایک علم دوست اور ماں باپ کے درمیان مکالمے کے ذریعہ بتائی گئی ہے۔ آخر میں عوام کی بیداری اور خود مختاری کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

نادار اور لاوارث بچوں کی پرداخت اور تعلیم پر بھی سید والا گہر کی توجہ تھی۔ اس کا اندازہ سفر نامے میں شامل ایک مراسلے مورخہ ۱۸ اپریل ۱۸۷۰ء سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے (ص، ۱۸۹ تا ۱۹۴)۔ لندن میں انھوں نے بہت سے بچہ گھر معائنہ کیے، جس میں سے ایک مسٹر ٹامس کوریم کا قائم کردہ تھا۔ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کی تفصیل انھوں نے ہندوستان اس لیے ارسال کی تاکہ اس نمونے پر یہاں بھی بیت الاطفال قائم ہوں (ص، ۱۸۹)۔ اسی طرح وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے عوام اور معمولی روزی کمانے والے بھی اسی طرح تعلیم یافتہ ہوں جیسے لندن کی گھریلو ملازمین اور ٹیکسی چلانے والے ہیں، جو روز کوئی کتاب یا اخبار پڑھتے ہیں۔ وہ مادری زبان میں تمام علوم کی تعلیم کو کامیابی اور ترقی کی کلید سمجھتے تھے، اور ان کے نزدیک انگلستان کی ترقی کا بڑا سبب یہی تھا۔ لندن سے ایک مراسلے میں انھوں نے باصرار لکھا تھا: ”میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حروف میں آئندہ کی یادگاری کے لیے کھودے جائیں۔ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیے جاویں گے، کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہ ہوے گا۔ یہی سچ ہے، یہی سچ ہے، یہی سچ ہے“ (ص، ۱۵۸)۔ وہ تعلیم کو سرکاری ملازمت سے جوڑنے کے بھی خلاف تھے، اور تعلیم میں سرکاری مداخلت ان کو پسند نہیں تھی۔ ملازمت نہیں بلکہ دانش مندی اور شائستگی تعلیم کا اصلی انعام ہے۔ قوم کو اپنی تعلیم کا انتظام خود اپنے اختیار میں رکھنا چاہیے۔ لندن ہی سے انھوں نے لکھا تھا: ”اے ہندوستان کی بھلائی چاہنے والو! تم کسی سے توقع مت رکھو، اور خود اپنے بھروسے اور آپس کے چندے سے اپنے ملک میں تمام علوم اعلیٰ درجے سے ادنیٰ درجے تک اپنی زبان میں پھیلاؤ۔ پھر جب تم علوم سے واقف ہو جاؤ گے اور شائستگی اور تربیت تک پہنچو گے، تب تمہاری نگاہ میں گورنمنٹ کی نوکریوں کے لالچ کی کچھ بھی حقیقت نہیں معلوم ہوگی۔ اُمید ہے کہ نہ کسی دن ایسا ہی ہوگا، ہوگا،

ہوگا“ (ص، ۱۸۹)۔

سفر نامے کے کئی اندراجات سے اس عام غلط فہمی کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کی ضرورت سے غافل تھے۔ ویسے تو ان کا مفصل جواب ان کے سفر پنجاب کے دوران امرتسر کی خواتین کے سپانامے کے جواب میں موجود ہے۔ لیکن انگلستان میں انھوں نے کئی مدارس بنات کا بغور معائنہ کیا، اور وہاں کے پبلک اداروں سے بہت متاثر ہوئے۔ ایک مراسلے میں انھوں نے لکھا ہے: ”پس ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو کون منع کرتا ہے کہ خود بلا مداخلت لڑکیوں کے پڑھانے کا انتظام کریں، اور تمام مذہبی اخلاق اپنے مذہب کے موافق تعلیم دیں۔ کیا ہندوستان ایسا نہیں کر سکتا ہے۔ کسی طرح وہ ان کاموں کے لیے بلکہ اس سے بہت بڑے کاموں کے لیے محتاج نہیں ہے۔ صرف شوق اور ہمت اور ارادہ چاہیے“ (ص، ۱۶۱ تا ۱۶۲)۔ ان کو بہت اشتیاق تھا کہ وہ وہاں عورتوں کے مدرسوں کا معائنہ کریں، اور اپنے مشاہدات سے اپنے ہم وطنوں کو مطلع کریں (ص، ۱۷۶)۔ شمالی لندن کا کالجیٹ اسکول برائے طالبات ایک معروف ادارہ تھا۔ اس کے متعلق مفصل معلومات ایک خط میں لکھی ہیں۔ جس میں کورس کی مدت، ہر سال کی فیس، درسی مضامین، رہائشی انتظام اور اختیاری دینی تعلیم کی فراہمی وغیرہ کے متعلق اطلاعات شامل ہیں۔

سفر نامے کا آخری مکتوب خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اس میں سید صاحب نے اپنے مذہبی خیالات کی بابت بدگمانیوں اور تہمتوں کی وضاحت کے ساتھ تردید پیش کی ہے۔ انداز بیان نرم اور دوستی طلب ہے۔ یہ خط ان کے مزاج اور مقصدیت کا آئینہ دار ہے۔ اس تحریر کے ہر فقرے سے انکسار، وطن دوستی، صلح پسندی اور تعاون کار کی چاہ ٹپکتی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس خاص طور سے دل چھو جانے والا، ان کے اسلوب نگارش کا یادگار نمونہ اور آج کے خلفشار زدہ ماحول میں ملک و ملت کے لیے سبق آموز ہے۔ ”اے یاراں وطن! رات تھوڑی، حسرتیں دل میں بہت، صلح کیجیے، بس لڑائی ہو چکی، شکوے شکایت ختم ہوئے، گلے مل لیجیے، وہ صفائی ہو گئی، اب اپنے ملک کی بھلائی پر متوجہ ہو جائیے۔ اپنے ملک کے بچوں کی تربیت کا بندوبست کیجیے، اور جو جو واجبی الزام ہمارے ملک پر ہیں، ان کو مٹائیے اور دنیا میں اپنے ملک کو تربیت یافتہ اور شائستہ ملک کر دکھا دیجئے۔ اور حیلوں اور بہانوں کو اٹھار کھئے“ (ص، ۲۷۴)۔

ہر اچھا سفر نامہ معلومات کا گنجینہ اور خبر نامہ تو ہوتا ہی ہے۔ ”مسافر ان لندن“ اس سب کچھ کے علاوہ تازیانہ شوق اور مصنف کا ضمیر نامہ بھی ہے۔ اس سفر کی بنیادی نیت خود استواری اور اپنے ہم وطنوں میں

ترویجِ تعلیم و خود اعتمادی تھی۔ اسی لیے غیر ارا دی طور پر مصنف کی اپنی ترجیحات فکر اور قومی حوصلوں کی جھلکیاں بھی در آئی ہیں۔ ان مراسلوں کی ابتدائی اشاعت تو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں قسط وار ہوئی، جواب نایاب ہیں، اور پہلی بار کتابی شکل میں مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۶۱ میں شائع ہوئے، جو ہندوستان میں کم یاب ہے۔ مزید برآں، اس میں گزٹ میں دیے بعض اہم متعلقہ مراسلے شامل نہیں ہیں۔ ان کا حالیہ ایڈیشن میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اردو خواں اور سرسید کے مداح، پروفیسر اصغر عباس کے ممنون و شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اصل متن کو گزٹ سے سطر اُسطر نقل کر کے تدوین و طباعت سے آراستہ کیا، اور فرہنگ و تعلیقات کے اضافے سے بعض نیم مجہول حوالوں اور واقعات سے بے خبری پڑھنے والے کے واسطے باعثِ تعقید ہوتی۔ سید عالی مقام کی ذات، خدماتِ ادب و انسانیت میں دلچسپی پروفیسر مذکور کے لیے اب صوفیانہ عشق کی منزل میں داخل ہو چکی ہے، اور ان کا ادبی سفر رہ سلوک میں ڈھل گیا ہے۔ اس منفرد انہماک کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ توجہ الی المرشد کے بیچ بیچ ادیب و نقاد کی ایک آنکھ گاہ گاہ نیم وار ہی ہے، اور مرشد کے متعلق غلط فہمیوں کے دُھند کو سُرمہ بصیرت و تحقیق سے اُجلا کرتی رہی ہے، جس کا مظہر ان کی ڈیڑھ درجن سے زائد تصانیف، مقدمات و تراجم ہیں۔ یہ بھی فال نیک کہ ان کا ہمارے قلم ہنوز پر فشاں ہے۔ □